"قصبہ کہانی"; تجزیاتی مطالعہ

Qasba Kahani, A Critical and Research Analysis.

محمد ذیشان وکیل
وزٹینگ لیکچرر (شعبہ اردو) جی سی یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر سفیر حیدر
اسسٹنٹ پروفیسر (شعبہ اردو) جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract:

Dr. Tabassum Kashmiri is known as a critic, researcher, poet and especially a historian. But he also wrote a novel, which was published in ۱۹۹۳. The novel was published under the title "Qasba Kahani". Literary critics have not paid much attention to this novel. The "Qasba Kahani" which offers new experiences of form. This article contains an analytical study of the novel "Qasba Kahani" which is an excellent example of an anti-hero in the history of Urdu novel.

کلیدی الفاظ۔ ، قصبہ کہانی، پروفیسر ساجد، مسٹر نعیم، اینٹی ہیرو، پیپر امپائر، آمریت

"قصبہ کہانی" ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا واحد ناول ہے جو ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول کے نام سے لگتا ہے کہ یہ کسی مخصوص قصبے کی کہانی ہے لیکن جن واقعات کا بیان اس ناول میں ملتا ہے وہ آفاقی نوعیت کے ہیں۔ "قصبہ کہانی" اپنے طرز کی انوکھی تحریر ہے۔ ایک ایسی کہانی جس میں اور بہت سی کہانیاں ہیں۔ بغیر کسی مرکزی کردار کے یہ ایک کامیاب سماجی ناول ہے جس میں معاشرے کا مرثیہ بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے روایتی طرزِ تحریر سے انحراف کرتے ہوئے "قصبہ کہانی" کی شکل میں ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ جس میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ اپنے ایک انٹرویو میں ناول "قصبہ کہانی" کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

"New experiments in litrature keep it fresh and uptodate. But in Urdu litrature, neither is taken the risk of experiment nor it's encouraged. I am against such an attitude. That is why, even in

my first attempt in fiction, I'hv not adopted any traditional or mutashaddadana form." (۱)

ترجمہ: ادب میں نئے تجربات اسے جلا بخشتے ہیں۔ لیکن اردو ادب میں نہ تو نئے تجربے کا خطرہ مول لیا جاتا ہے، نہ ہی اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ میں اس رویے کے خلاف ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی پہلی کاوش میں ہی روایتی اور متشددانہ روش سے گریز کیا ہے۔

"قصبہ کہانی" میں مختلف کردار وقفے وقفے سے سامنے آتے ہیں اور پھر سماج کے ایک ایک پہلو سے پردہ اٹھاتے ہوئے خود اوجھل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ناول میں کرداروں کے دو گروہ ہیں جو ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں۔ جیلانی کامران "قصبہ کہانی" کے کرداروں کے متعلق لکھتے ہیں:

"Tabbasum Kasmiri's novel contains two independent sets of characters: the representatives of ugly moral behaviour, and the educated intelectuals who are progressive, indolent and inert, and only suffer with the ugly environment." (۲)

ترجمہ: تبسم کاشمیری کے ناول میں دو طرح کے کردار ملتے ہیں۔ ایک تو اخلاقی ابتری کے نمائندہ کردار اور دوسری طرف تعلیم یافتہ دانشور جو ترقی پسند، حساس اور سست ہیں اور ابتر صورت حال کا سامنا کرتے ہیں۔ اوپر بیان کردہ کرداروں میں ایک گروہ عام ذہنی صلاحیت کا حامل ہے۔ جب کہ دوسرا گروہ دانشورانہ سوچ کا مالک ہے۔ "قصبہ کہانی" ان ہی دو مختلف ذہنی صلاحیتوں کے حامل کرداروں کے گرد گھومتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کہتے ہیں:

"Qasba Kahani is a story of every town in which live two kind of people, i.e., simple minded and intellectuals. Obviously, the novel deals with these two classes." (۳)

ترجمہ: قصبہ کہانی ہر اس قصبے کی کہانی ہے جہاں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں دوسرے الفاظ میں سادہ لوح اور دانشور۔ بلاشبہ یہ ناول انہی دو طبقات کی کہانی ہے۔"

"قصبہ کہانی" میں جو منظر سب سے پہلے دیکھنے کو ملتا ہے وہ نظام باربر کی دُکان کا ہے جو اس کے آباؤ اجداد کی یادگار ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف کرداروں کو قاری سے متعارف کرانے میں مصنف کی مدد کرتی ہے۔ یہ دُکان پرانی چھوٹی اینٹوں سے بنی ہے جو اب بھر بھری ہو چکی ہیں۔ ناول نگار نے نظام باربر کی دُکان کا جو نقشہ ناول میں کھینچا ہے مثلاً دیواروں پر رنگین فلموں کے پوسٹر، مغربی ایکٹرسوں کی نیم عریاں تصویریں، پرانا

پنکھا، دھندلا شیشہ اور گھسے پٹے بالوں والا شیونگ برش یہ سب جزیات مل کر کسی بھی قصبہ میں موجود حجام کی دُکان کا ایک واضح اور حقیقی عکس پیش کرتے ہیں۔

ناول میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کی اصلیت بے نقاب کی گئی ہے۔ محکمہ پولیس کی رشوت ستانیوں اور پھرتیوں کے علاوہ پولیس کے روایتی لب ولہجہ کی گونج بھی ناول میں سنائی دیتی ہے۔ اس کی واضح مثال نظام باربر اور حوالدار احمد دین کے درمیان قصبے میں بڑھتی ہوئی چوری کی وارداتوں پر ہونے والی گفتگو ہے ملاحظہ کیجیے:

"حوالدار جی! سنا ہے شہر کے اخباروں میں چوری کی خبریں چھپ گئی ہیں۔
ہاں چھپ گئی ہیں تو کیا ہوا؟ ایسی خبریں ہمیشہ ہی چھپتی رہتی ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔
جی اخبار میں آگیا ہے کہ ڈی- آئی- جی ادھر آرہا ہے۔
نظام سنو! یہ افواہیں ہیں، افواہیں نہ سنا کرو نہ پھیلایا کرو۔"(۴)

پولیس اور انتظامی ادارے، بدمعاشوں اور منشیات فروشوں سے ملے ہوئے ہیں اور آواز یہ لگاتے ہیں کہ جرائم کا خاتمہ کیا جائے گا۔ مصنف نے معاشرتی برائیوں اور سسٹم کی خرابی کو بہترین پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر جب ساجے کے اڈے پر پانچ نوجوان زہریلی شراب پینے سے مر جاتے ہیں تو حوالدار ساجے کو تو بچا لیتا ہے اور اس کی جگہ کامی کو پھنسا دیتا ہے۔ پھر کامی کا بیٹا نامی شہر کے چند بڑے افسروں کو رشوت دے کر اپنے باپ کو چھڑا لیتا ہے اور اس طرح پانچ انسانوں کی موت کا قصہ اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

حوالدار احمد دین کا قریبی کھیت سے محنت کش کو پکڑ لانا اور اس کی جیب میں موجود چار سو روپے ہتھیا کر اسے چھوڑ دینا۔ جواریوں سے رشوت لے کر انہیں چھوڑ دینا اور سپاہی رحیم خاں کا بازار سے مداری کو پکڑ کر لانا اور رشوت نہ ملنے پر اس کے خلاف رپورٹ تیار کرنا کہ تماشا کے سبب بازار میں ٹریفک حادثہ ہو سکتا تھا۔ کوئی سیاسی ہنگامہ ہو سکتا تھا جس سے نقص امن کا خطرہ تھا۔ یہ وہ تمام واقعات ہیں جو قانون لاگو کرنے والے اداروں میں موجود عملے کے سیاہ چہروں کو بے نقاب کرتے ہیں۔

شہری زندگی، انسانوں میں بڑھتے ہوئے فاصلے، معاشرتی کشمکش، انسانوں میں بڑھتی ہوئی خود غرضی، بدلتے ہوئے رویے اور محبت کا فقدان یہ سب عوامل اجنبیت (Alienation) کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ گاؤں، قصبوں اور قصبے، شہروں کا روپ دھارتے جا رہے ہیں۔ "قصبہ کہانی" میں بھی ایسی ہی صورت حال نظر آتی ہے:

" ....اس زمانے میں قصبے کی آبادی بھی چند ہزار تھی اور آبادی کے چاروں طرف کھیت تھے یا باغات۔ اب ان جگہوں پر لالہ زار کالونی، حسن آباد اور دوسری بہت سی آبادیاں وجود میں آگئی

ہیں۔ اس وقت یہ سب کچھ بے نام تھا۔ صرف کھیت ہی کھیت تھے اور اب انسان ہی انسان ہیں۔
پہلے میں قصبے کے پیشتر لوگوں کو جانتا تھا اور لوگ مجھے جانتے تھے۔ اب میں بہت کم لوگوں کو
جانتا ہوں خود میری شناخت بھی محدود ہو گئی ہے۔ پرسوں میں بڑے ڈاک خانے پارسل وصول
کرنے کے لیے گیا تو ڈاک بابو نے میرا شناختی کارڈ طلب کیا۔ اب تک ڈاک خانے میں میرے
شاگرد بیٹھتے تھے، پھر شاگردوں کے شاگرد بیٹھنے لگے اور اب شناختی کارڈ مانگنے والے بیٹھتے ہیں۔
اب انسانوں کی شناخت ان کی شخصیت کی خوشبو سے نہیں، ان کے شناختی کارڈ سے کی جاتی ہے
اب ذات کی شناخت گم ہو رہی ہے۔"۵

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے "قصبہ کہانی" میں ہمارے سماج میں پائی جانے والی ایسی برائیوں کی نقاب کشائی کی ہے جنھیں معاشرہ خاموشی سے دیکھ رہا ہے اور لب کشائی کی جرات نہیں۔ یہ تمام برائیاں اسی سماج کا حصہ ہیں جس میں ہم سانس لے رہے ہیں جو سماجی بدہیئتی کا منہ بولتا ثبوت ہیں:

"All the incidences I have prsented are real and have been in my study.... But people don't like to see such incidences publicised."

(۶)

ترجمہ: میں نے جو بھی واقعات پیش کیے ہیں وہ سب حقیقی ہیں اور میرے زیرِ مطالعہ رہے ہیں۔
لیکن لوگ ان واقعات کی تشہیر کو پسند نہیں کرتے۔

ناول میں عام ذہنی صلاحیت کے حامل کردار اخلاقی ابتری کی حالت میں ہیں۔ مثلاً چودھری خدا بخش کا کردار ایک ظالم زمیندار کا کردار ہے۔ یہ کردار اس طبقے کا نمائندہ ہے جو غریب اور بے بس لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے یہ امید بھی پیدا کی ہے کہ ظالم خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو اس کے ظلم کا خاتمہ ضرور ہوتا ہے۔ چودھری خدا بخش کی دردناک موت اس پر دلیل ہے۔

تکیہ موتی شاہ کا متولی عمر رسیدہ ہے۔ جو چھڑی کے سہارے چلتا ہے۔ بزرگانِ دین سے عقیدت کی وجہ سے جو قصے، حکایات و کرامات منسوب ہوتی ہیں کچھ ایسی ہی کرامات موتی شاہ سے بھی منسوب ہیں۔ متولی شاہ جو اسی معاشرے کا حصہ ہے جس میں ہم لوگ رہتے ہیں۔ بظاہر لوگوں کو بڑا نیک نظر آتا ہے لیکن جوانی میں اس نے بھی کوئی پارسا زندگی نہیں گزاری۔ سوہنی مہینوال کے کھیل کی ہیروئن کے ساتھ متولی شاہ کا معاشقہ اور اس کے ساتھ گزاری راتوں کا سرخ رنگ متولی شاہ کی نام نہاد پارسائی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مذہب کے ٹھیکیداروں کا نمائندہ کردار مولوی احمد دین ہے۔ جو متولی شاہ کی تکیہ موتی شاہ سے وابستگی کو شرک سمجھتے ہوئے اس کے لیے ہدایت کی دعا کرتا ہے مولوی احمد دین کی باتیں سن کر نظام بار بار اسے وہابی قرار دیتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے یہاں فرقہ واریت کی طرف اشارہ کیا ہے جس نے ہمارے معاشرے کو

بری طرح لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ مولوی احمد دین کے نزدیک تمام برائیوں اور حادثات کی وجہ شرک ہے اور شرک صرف درس گاہوں، خانقاہوں اور تکیوں میں کیا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ کسی نئے قانون کے تحت انہیں بند کرا دینا چاہتا ہے۔ مذہب کے ٹھیکیدار ٹیلی وژن، وی۔ سی۔ آر، ڈرامہ، فلم، موسیقی کو بُرا سمجھتے ہیں جب کہ مولوی احمد دین کے گھر ٹیلی وژن، ویڈیو مشین اور سٹیریو بھی موجود ہے۔ ”قصبہ کہانی“ میں اس منافقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

فلاحی اداروں میں یتیموں، مسکینوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیاں، معاشرتی ناانصافیاں، استحصالی معاشرہ جہاں کسی کا بھی مستقبل محفوظ نہیں یہی وہ حالات ہیں جو ہمراز جیسے کرداروں کو جنم دیتے ہیں۔ ہمراز یہ نہیں چاہتا کہ اس کے بعد اس کی بیوی بچے اس بے رحم اور غیر محفوظ سماج میں در در کی ٹھوکریں کھاتے پھریں کیوں کہ ہمراز اپنا بچپن یتیم خانے میں گزار چکا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس کردار کی زبانی فلاحی اداروں کی حقیقی تصویر پیش کی ہے:

> ”انجمن فلاح کا یتیم خانہ ایک نجی بندی خانے کی طرح تھا۔ جہاں پر ہم سب بچے ناظم اور مینجر کے رحم و کرم پر ہوتے تھے۔ ہفتے کے بعد نہانے کے لیے گھٹیا قسم کا صابن ملتا تھا۔ ایک ہی صابن سے پچاس بچے باری باری نہاتے تھے۔ مہینوں تک بستروں کی گندی چادریں نہ دھو سکتے تھے۔ کھانے کے نام پر بچوں کو نام نہاد خوراک ملتی تھی۔ دراصل انجمن کا ناظم اور مینجر مل کر چندے کا بیشتر حصہ خود دکھا جاتے تھے۔“(۷)

یہی وہ عوامل ہیں جو ہمراز جیسے شریف انسان کو اپنے بیوی بچوں کا مستقبل محفوظ بنانے کے لیے قصبے میں موجود یتیم خانے کے ناظم کے گھر چوری کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ قصبے کے یتیم خانے نے ہمراز کو محرومیوں اور دکھوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔

ہمراز اور قصبے میں موجود صحافی قیوم کے درمیان یک طرفہ خط و کتابت کے ذریعے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے فلاحی اداروں جنہیں کروڑوں کے فنڈز دیے جاتے ہیں اور جنہیں حکومتی سرپرستی بھی حاصل ہوتی ہے ان اداروں کو چلانے والے نام نہاد معززین کے سیاہ دل، کرتوت اور اخلاقی ابتری کو بے نقاب کیا ہے۔

دانشورانہ خیالات اور بحث و مباحثہ کے فروغ میں قہوہ خانوں کو اہمیت حاصل ہے۔ ”قصبہ کہانی“ میں چائے خانہ نور آباد کا ذکر ملتا ہے جسے قصبے کی مجلسی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس قہوہ خانے کا ایک گوشہ مقامی کالج کے اساتذہ اور ان کے دوستوں، صحافیوں کے لیے مختص ہے جو سرِ شام ہی یہاں آ بیٹھتے ہیں اور رات دیر گئے تک بحث و مباحثے میں مصروف رہتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں قاری Intellactual minded characters سے متعارف ہوتا ہے۔ یہاں مستقل بیٹھنے والوں میں پروفیسر ساجد، ضیا اور جاوید جو

مقامی کالج کے اساتذہ ہیں، تابی ان کا دوست، سلطان سرکاری ملازم اور کچھ مشہور صحافی ہیں، یہ سب اس مجلس کو "حلقہ یاراں" کہتے ہیں۔

چائے خانہ نور آباد اور "حلقہ یاراں" کی عملی زندگی میں مثال پاک ٹی ہاؤس، لاہور اور اس میں آئے روز منعقد ہونے والی ادبی بحث و مباحثے کی محفلیں ہیں۔ ناول کا یہ حصہ خالصتاً شعوری کاوش معلوم ہوتا ہے کیوں کہ مصنف خود ایک عرصہ تک پاک ٹی ہاؤس میں منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ اس حصہ میں پائے جانے والے خیالات ترقی پسند سوچ کو ظاہر کرتے ہیں۔

مجلسی زندگی سے وابستہ یہ لوگ اعلیٰ ترین آدرشوں کے مالک ہیں جو اس بد ہیئت سماج کو خوب صورت بنانا چاہتے ہیں۔ ان کا خواب ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے جہاں ہر انسان کے بلا تفریق سیاسی، سماجی اور اقتصادی حقوق کا تحفظ ہو گا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے سماج میں بڑھتی ہوئی منافقت، فریب، دھوکہ دہی، مکر، چال بازی، لوٹ مار، افراتفری، ظلم اور ضمیر فروشی کی طرف توجہ دلائی ہے: ہمارا سماج آفاقی سچائیوں سے بالکل محروم ہوتا جا رہا ہے۔ شاید محروم ہو چکا ہے۔ یہ ہمارا المیہ ہے۔ بہت بڑا المیہ۔ مگر اس اثاثے کے لٹ جانے کا لوگوں کو احساس بھی نہیں ہے۔ کوئی دکھ بھی نہیں۔"(۸) بقول اقبال

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

لکھاری معاشرے کا حساس طبقہ ہوتا ہے۔ جب بھی ظلم و ناانصافی نے سر اٹھایا ہے، بھاری بھرکم بوٹ پہننے والوں نے چاہے نام نہاد جمہوریت پر ہی حملہ کیوں نہ کیا ہو لکھنے والوں نے زبانِ قلم سے اس کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ جس کے نتیجہ میں دنیا بھر کا مزاحمتی ادب سامنے آیا ہے۔ "قصبہ کہانی" میں زمانہ آمریت کی منظر کشی ملتی ہے۔ یہ ایک تاریک دور کا مرثیہ ہے۔ "قصبہ کہانی" کے متعلق ڈاکٹر تبسم کاشمیری کہتے ہیں:

> "The force behind the creation of Qasba Kahani was an unwanted period of oppression, a period of ۱۵ years which forced people to live a miserable life.... I wanted to unveil the vitimising process of this tyranny." (۹)

ترجمہ: قصبہ کہانی کی تخلیق کا محرک ظلم کا ایک غیر مطلوبہ دور ہے۔ پندرہ سالوں پر مشتمل ایسا دور جس نے لوگوں کو کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا.... میں نے اس ظلم کے عوامل سے پردہ اٹھانا چاہا ہے۔

جس دور میں ناول "قصبہ کہانی" لکھا گیا لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ جمہوریت مسائل کا حل ہے۔ گویا یہ ایک نیلم پری ہے جو جادوئی چھڑی لیے ہوئے ہے اور جس کے آنے سے آمریت کا کالا دیو بھاگ جائے گا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایک عام آدمی کو آمریت، جمہوریت، پارلیمنٹ میں ہونے والی لمبی بحثوں سے کچھ لینا دینا نہیں۔ وہ تو اپنے حیوانی وجود کے مسائل اور ضروریات ہی کا ادراک رکھتا ہے۔ ناول میں ایک مزدور سیدھے سادے انداز میں قصبہ میں آئے سیاسی کارکن جو جمہوریت کا پرچار کرنے میں مصروف ہے اس سے پوچھتا ہے کیا جمہوریت انہیں روٹی، کپڑا وغیرہ دے سکتی ہے؟ لیکن سیاسی کارکن کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ”قصبہ کہانی“ میں ایسے سوالات اٹھائے ہیں جن کا جواب جمہوریت کا پرچار کرنے والے سیاسی کارکن ہوں یا جمہوری سیاست دان کوئی نہیں دے سکتا۔ دراصل جو لوگ مختلف نظریات کا پرچار کرتے ہیں وہ ان نظریات کو انسانی مسائل کے حل سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نظریے کے اطلاق سے بنیادی انسانی مسائل حل ہو جائیں گے۔ مگر ایسا ہو نہیں پاتا۔ کیوں کہ نظریہ ایک مجرد (Abstract) چیز ہے۔ یہ ہمارے سامنے مجسم (Concrete) صورت میں نہیں آئے گا۔ مجسم صورت میں ہمارا واسطہ انسان ہی سے پڑتا ہے اور یہ ہرگز ضروری نہیں اور نہ ہی ایسا ہوتا ہے کی جو شخص جس نظریے کا پرچار کرے اس پر عمل بھی کرے۔ بعض اوقات نظریات کا پرچار اکثریتی عوام کی ہمدردیاں لینے اور طاقت کے حصول کے لیے کیا جاتا ہے مگر جب طاقت ملتی ہے تو وہ بھول جاتے ہیں کہ دکھی انسانیت کی سیوا بھی کوئی چیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

Power corrupts and absolute power corrupts absolutely.

ترجمہ: طاقت بے ایمان بنا دیتی ہے اور مطلق طاقت مطلقاً بے ایمان بنا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کی ”قصبہ کہانی“ میں جو سوالات مصنف نے ایک عام مزدور، محنت کش کی زبان سے اٹھائے ہیں ان کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔

”قصبہ کہانی“ ایک بُرے دور کا اچھا تجزیہ ہے۔ سیاہ آمریت کے دور میں لکھا گیا یہ ناول اس دور میں جو کچھ پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ ہو رہا تھا اس کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ سیاہ آمریت کا دور اور آمر کے نام کا مطلب "سچائی کی روشنی" ہے۔ اسی تضاد کی بنا پر تو حبیب جالب نے کہا تھا:

”ظلمت کو ضیا، صرصر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا
پتھر کو گہر، دے وار کو در، کرگس کو ہما کیا لکھنا
اک حشر بپا ہے گھر گھر میں دم گھٹتا ہے گنبدِ بے در میں
اک شخص کے ہاتھوں مدت سے رسوا ہے وطن دنیا بھر میں
اے دیدہ ور اس ذلت کو قسمت کا لکھا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صرصر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا“(۱۰)

آمریت کے خلاف آواز اٹھانے والوں اور حق کا ساتھ دینے والوں پر ہمیشہ سے ظلم ہوتے آئے ہیں۔ کچھ ایسی ہی مثالیں ہمیں ''قصبہ کہانی'' میں بھی ملتی ہیں۔ نفسیات کا پروفیسر ساجد انتظامیہ اور محمد خاں آزاد مزدوروں کے حق میں اور استحصالی نظام کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ اس پر انتظامیہ نے جو سلوک ان کے ساتھ کیا وہ انتظامی اداروں کی بے حسی کو ظاہر کرتا ہے۔

چائلڈ لیبر اور خصوصاً قالین بافی میں پاکستان پر چائلڈ لیبر کے الزامات عالمی سطح پر لگائے گئے اور اس مسئلہ کے پیشِ نظر پاکستان پر اقتصادی پابندیاں بھی لگائی گئی تھیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ناول میں مزدور طبقے کے مسائل کو قصبہ میں موجود قالین بنانے والے کارخانے کا مختصر نقشہ کھینچ کر دردناک انداز میں بیان کیا ہے جہاں پر بچے کام کرتے ہیں:

> ''قالین بافی کے کارخانے کی حالت زیادہ بری ہے۔ کچی چھتوں والے کمزور کارخانوں میں بچے اور مزدور کام کرتے ہیں۔ گرمی کے دنوں میں سورج کی تمازت دیواروں اور کمزور چھتوں کو چیر کر کارکنوں کی چربی پگھلاتی ہے۔ وہ بار بار پانی پیتے ہیں۔ پسینے میں نہائے کام پر لگے رہتے ہیں۔ گرمی میں شاگرد بچوں کے دماغ چکرا جاتے ہیں۔ ان دنوں ایک بچہ گرمی لگنے سے گر گیا۔ اسے ہسپتال بھیجا گیا۔ دوسرے دن وہ مر گیا۔'' (۱۱)

محمد خاں آزاد جب مزدوروں کے مسائل حل کرنے کے لیے جلسہ بلاتا ہے تو اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ یہی وہ حالات ہیں جو لکھنے والے کو سماج اور استحصالی معاشرے کا گھناؤنا چہرہ بے نقاب کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ بقول اقبال

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات

پروفیسر ساجد آزادی کے ساتھ انسانی حقوق چاہتا ہے اور جب وہ انتظامیہ کے رویوں اور اقدامات کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو انتظامیہ اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔ پڑھے لکھے ترقی پسند سوچ کے مالک لوگ اگرچہ خود باعمل نہیں ہوتے لیکن ان کی باتیں، نظریات لوگوں کا دماغ خراب کر سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ سرکار کے لیے بالواسطہ خطرہ بن سکتے ہیں۔ پس آمریت ان سے جان چھڑانا ضروری سمجھتی ہے۔ ایسے لوگوں کو یا تو قید کر دیا جاتا ہے یا جلاوطن۔ ماضی میں ہمیں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ فیض احمد فیض نے دورِ آمریت میں جلاوطنی کی زندگی گزاری، اسی طرح حبیب جالب کو بھی اپنے نظریات اور بے باک نوکِ قلم کی بنا پر متعدد بار جیل جانا پڑا۔ ''قصبہ کہانی'' میں ان حقائق سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ جب ظلم کے خلاف آواز بلند کی جائے تو طاقتور، کمزور اور

بے بس لوگوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ پروفیسر ساجد کے نظریات کا جب انتظامیہ کو علم ہوتا ہے تو اس کا تبادلہ لاحاصل پور نام کی بستی میں کر دیا جاتا ہے۔ لاحاصل پور کا جو تعارف ناول میں کرایا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بستی کی حیثیت علامتی ہے:

> ”اس بستی میں انسان سالہا سال سے ہَل چلا رہے ہیں۔ بیج بو رہے ہیں۔ پانی دے رہے ہیں مگر فصل حاصل نہیں ہوتی۔ باغبان پھل دار درخت لگا کر شاخوں کی طرف مدتوں سے دیکھ رہے ہیں۔ شاخوں پر نہ بور آتی ہے نہ پھل ظاہر ہوتا ہے۔ بستی پر سال میں کئی بار بارش ہوتی ہے۔ مگر بستی کا سینہ خشک رہتا ہے۔ آسمان پر سورج چمکتا ہے مگر اس کی حرارت بستی کے اوپر اوپر رہتی ہے۔“(۱۲)

ناول میں جو نقشہ لاحاصل پور کا کھینچا گیا ہے۔ اس میں فطرت جامد، بے حس اور بے پرواد کھائی دیتی ہے۔ لیکن ایک اور چیز جو قابل توجہ ہے وہ کسانوں کا سالہا سال ہَل چلانا، بیج بونا اور مدتوں پھل کے انتظار میں درختوں کی شاخوں کی طرف دیکھنا ہے۔ اس سے مصنف کا رجائیت کی طرف رجحان سامنے آتا ہے۔ یہ لاحاصل جو کہ قاری کے ضمیر کے لیے بھی پریشان کن ہے سے حاصل کی طرف ایک سفر ہے کہ کسانوں نے یا یوں کہہ لیجیے کہ مزدوروں، محنت کشوں نے استحصال اور سماج کے ناروا سلوک کے باوجود امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ یہ قاری کے پریشان حال ضمیر کے کیتھارسس کی صورت حال ہے۔

ساجد کے پاس جرات انکار نہیں ہے اور ہو بھی کیسے کہ پڑھے لکھے شخص کے پاس سوائے نوکری کے روٹی کمانے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ حکمِ سرکار بجالاتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ جانا کہاں ہے یہ گویا علامتی طور پر پڑھے لکھے شخص کی بے سمتی Directionlessness کا اظہار ہے۔ پروفیسر ساجد کالج کے پرنسپل سے لاحاصل پور کا راستہ پوچھتا ہے لیکن اسے بھی کچھ معلوم نہیں۔ پھر ایک سرکاری افسر، کاغذ پر نقشہ بنا دیتا ہے۔ دورانِ سفر کاغذ، پروفیسر ساجد کو خاموش بستی کے باسیوں کی المناک کہانی پر افسوس کرنے پر دھمکی دیتا ہے کہ میں سرکاری کاغذ ہوں شہر جا کر تمہاری شکایت بھی کر سکتا ہوں۔ یہاں پر سرکاری کاغذ کی تجسیم کی گئی ہے اور ظاہر کیا گیا ہے کہ کاغذ انسانوں سے زیادہ جانتا ہے یعنی کاغذ انسان سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے ایک جدید نظریہ سلطنت (Paper Empire) سامنے آتا ہے۔ جس میں ایک کاغذ کی اہمیت انسان سے زیادہ ہے۔

خاموش بستی کے لوگ جو پہلے بولتے تھے، تختِ شاہی کے خلاف، ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔ تختِ شاہی نے ان کے دماغ نکلوا دیے ہیں یعنی سوچنے کی صلاحیت سلب کر دی گئی اور قوتِ گویائی بھی چھین لی گئی تاکہ وہ حکومت کے لیے کوئی خطرہ نہ بن سکیں۔ دراصل ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس مقام پر

آمریت کے مظالم کی طرف توجہ دلائی ہے جہاں لوگوں کے بولنے کی، اظہار رائے کی آزادی نہیں ہوتی تاکہ عوام بے علم رہیں اور آمریت کے خلاف آواز نہ اٹھا سکیں۔ انھوں نے علامتی و تمثیلی انداز میں آمریت کا بھیانک نقشہ کھینچا ہے۔

ناول میں ایک پینٹنگ ہے جو کسی گمنام مصور کے فن کا اظہار ہے۔ اس پینٹنگ کا تعلق مشرقِ بعید سے ہے۔ اس میں ایک جوالا مکھی ہے جس کے دہانے سے لاوا اُبل رہا ہے۔ ایک رَسے کا پُل ہے جس پر ساکت انسان کھڑا ہے اور اس پُل کی دوسری جانب ایک برق رفتار گھوڑا کھڑا ہے۔ دشوار گزار گھاٹیوں اور دروں کے بعد ایک چوٹی دکھائی دیتی ہے جس پر پھول کھلے ہیں۔ قریب ہی ایک بستی کا منظر بھی ہے جس کے لوگ عنقریب جوالا مکھی سے ہونے والی ممکنہ تباہی سے بے خبر ہیں۔

پڑھے لکھے طبقے سے تعلق رکھنے والے کردار، پروفیسر صباء، مسز صباء اور پروفیسر جاوید سب ہی اس پینٹنگ کو دیکھتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے گھورتے ہیں۔ دراصل یہ پینٹنگ انسانی بے سمتی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ رسے کے پُل پر کھڑا ساکت انسان، انسانی ذہن کی جمودی حالت کی طرف اشارہ ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ایک عرصہ تک جاپان میں مقیم رہے ہیں جو مشرق بعید میں واقع ہے۔ جب کہ پینٹنگ بنانے والے مصور کا تعلق بھی مشرق بعید سے ہے جہاں دوسری جنگ عظیم میں ایٹم بم گرائے گئے جو انسانی بے سمتی و بے حسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ناول کا اختتام اسی پینٹنگ پر ہوتا ہے۔ جوالا مکھی، انسان کے بنائے ہوئے جوہری ہتھیاروں کی طرف جب کہ ساکت انسان آمریت کی طرف اشارہ ہے جس نے انسانی سوچ کو زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ پروفیسر جاوید پُل پر موجود ساکت انسان کو مزید برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور وہ اس پینٹنگ کو جلا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے جلتی ہوئی تصویر میں زندگی کی لہر نظر آتی ہے۔ تصویر میں زندگی کی لہر نظر آنا، انسانی بے سمتی اور آمریت کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ جس کا اظہار پروفیسر جاوید پہلے ہی پینٹنگ کو جلا کر کر چکا ہے۔ آخر پر نیلے آسمان اور سرخ پھولوں کے امیجز آتے ہیں جن سے قاری کو امید کا پیغام ملتا ہے کہ انسان جمود سے نکل کر مسلسل مثبت حرکت اور جستجو سے اپنی دنیا کو رنگین بنا سکتا ہے۔

"قصبہ کہانی" کے پلاٹ کو روایتی طریقے سے نہیں پرکھا جا سکتا۔ ناول کا کوئی مرکزی کردار نہیں ہے جو آخر تک قاری کے ساتھ رہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے شعور کی رو کا استعمال کیا ہے۔ ناول میں پیش آنے والے واقعات کو جوڑنے کے لیے بھی شعور کی رو استعمال کی گئی ہے۔ لیکن وہ اس میں زیادہ کامیاب ہوتے دکھائی نہیں دیتے یہی وجہ ہے کہ ناول پڑھتے ہوئے قاری کو بے ربطی کا احساس ہوتا ہے۔

"قصبہ کہانی" ہیئت کے اعتبار سے روایتی ناولوں سے مختلف ہے۔ ناول میں ہیئت کے کچھ مسائل نظر آتے ہیں لیکن ان پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اردو ادب ہیئت کے زمانے سے نکل چکا ہے اور جدید لکھاری بھی ہیئت کو خاص اہمیت نہیں دیتے لہٰذا مصنف کو اس معاملے میں آزادی حاصل ہے۔ وہ جدید اردو افسانے کی روایت کی پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

مکالمات کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ کرداروں کے عین مطابق ہیں۔ یعنی کردار جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ان کی گفتگو کا انداز بھی ویسا ہی ہے اور لب و لہجہ بھی۔ ہر کردار کے مکالمے اس کی ذہنیت کے غماز ہیں۔ مثلاً متولی شاہ اور حکیم حکم دین، نظام باربر اور حوالدار، کامی بدمعاش اور سپاہی نور دین کے علاوہ چائے خانہ نور آباد میں بیٹھنے والے "حلقہ یاراں" سے وابستہ پروفیسر ساجد، پروفیسر جاوید، پروفیسر صباء اور مسز صباء اور دیگر پڑھے لکھے کرداروں کے مکالمے اور گفتگو اپنے مزاج اور ماحول کے مطابق ہے۔

اگر اسلوب کے حوالے سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے پنجابی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ جس سے کہانی میں مقامی رنگ نظر آتا ہے۔ مثلاً نظام باربر، حوالدار کی شیو بنا رہا ہے اس دوران ہونے والی گفتگو ملاحظہ فرمائیں:

"نظام تم نے ٹھوڈی پر ڈونگا ٹک لگا دیا ہے۔

دھیان کر۔

اوہ حوالدار جی مافی دیو، ابھی پھٹکڑی لگاتا ہوں اس ٹک پر۔" (۱۳)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو "قصبہ کہانی" فکری لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ناول میں سماج کے ظالمانہ رویے، ناانصافیوں، انتظامیہ کی بے حسی، اخلاقی ابتری، طاقت کی سیاست، مشینی دور میں بدلتے ہوئے انسانی رویے، فلاحی اداروں کی ابتر صورت حال کے علاوہ آمریت کی برائیوں کا بھی احاطہ کیا ہے جس میں قوت گویائی سلب کر لی جاتی ہے اور حق خود ارادیت (Self Determination) کو جرم تصور کیا جاتا ہے۔

فنی لحاظ سے ناول میں کہیں کہیں بے ربطی ملتی ہے لیکن اسلوب کے اعتبار سے یہ ایک کامیاب ناول ہے۔ جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے تو اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا مصنف کو اس میں مکمل آزادی حاصل ہے۔ ناول میں دل چسپی کا عنصر کم ہے اور جہاں دل چسپی پیدا ہوتی ہے وہاں ناول، ناول کے دائرے سے نکل کر داستانی رنگ میں ڈھلتا دکھائی دیتا ہے۔ ان سب چیزوں کے باوجود بغیر کسی مرکزی کردار کے بہت سے کرداروں کے ساتھ یہ ایک کامیاب سماجی ناول ہے جو قاری کو معاشرتی بدحالی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱. Tabassum Kashmiri, Dr., "The Nation" (Midweek) (Lahore: April ۲۸, ۱۹۹۳). P۱۹

۲. Gilani Kamran, The controversy about optimism, "The Frontier Post"(Lahore: Thursday,March ۲۵, ۱۹۹۳)

۳. Tabassum Kashmiri, Dr., "The Nation" (Midweek) (Lahore: April ۲۸, ۱۹۹۳). P۱۷

۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، قصبہ کہانی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء)، ص ۸

۵۔ ایضاً، ص ۱۳

۶. Tabassum Kashmiri, Dr., "The Nation" (Midweek) (Lahore: April ۲۸, ۱۹۹۳). P ۱۷

۷۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، قصبہ کہانی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء)، ص ۸۹

۸۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۹. Tabassum Kasmiri, Dr., "The Nation" (Midweek) (Lahore: April ۲۸, ۱۹۹۳). P ۱۷

۱۰۔ حبیب جالب، کلیاتِ حبیب جالب، (لاہور: ماورا پبلشر، بار چہارم، ۲۰۰۵ء) ص ۱۸۱

۱۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، قصبہ کہانی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء) ص ۱۴۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۷۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۸